شملہ وفد: ایک نیا تناظر

احمد سعید

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کا دن مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس روز ۳۵ رکنی ایک وفد نے سر آغا خان سوم کی زیرِ قیادت گورنر جنرل لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی تھی اور اسے مسلم قوم کی طرف سے چند مطالبات پیش کیے تھے جن میں اہم ترین مطالبہ جداگانہ انتخاب سے متعلق تھا جس کی بنیاد پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

شملہ وفد نے گورنر جنرل لارڈ منٹو کو یاد دلایا کہ مسلمانانِ ہند اس برِ عظیم پر کئی سو سال تک حکمرانی کر چکے ہیں اور وہ ایک جداگانہ شناخت کے مالک ہیں۔ برِ عظیم میں وہ اقلیت میں ہیں اور اگر انتخابات کا طریقہ رائج کیا گیا تو وہ اپنے حقوق کی نگہداشت نہیں کر سکیں گے، اس لیے نامزدگی کی بجائے انتخاب کے ذریعے انھیں اپنے نمائندے خود منتخب کرنے کا اختیار ملنا چاہیے۔

اگرچہ لارڈ منٹو نے وفد کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس معاملے میں ان کی اعانت کرے گا، لیکن یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمانوں کو یہ حق بہت تگ و دو کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اسی روز سے ہندوؤں کی جانب سے جداگانہ انتخاب کی شدید مخالفت سامنے آئی۔ اس مخالفت کا بنیادی محرک یہ تھا کہ جداگانہ انتخاب نے دو قومی نظریے کا بیج بو دیا جس نے بقول سید رضا علی آگے چل کر پاکستان کے تناور درخت کی صورت اختیار کر لی۔ ہندو اور پاکستان مخالف مؤرخین نے بعد ازاں جداگانہ انتخاب کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور شب و روز یہ ثابت کرنے میں مصروف ہو گئے کہ جداگانہ انتخاب کا پودا انگریزوں نے لگایا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا کی جا سکے۔

اس سلسلے میں ان مؤرخین نے بہت سی خود ساختہ کڑیوں کو جوڑ کر اپنا موقف صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کے اجراء نے "دو قومی نظریہ" پیدا نہیں کیا بلکہ دو قومی نظریہ تو اسی روز معرضِ وجود میں آ گیا تھا جس روز پہلے مسلمان نے سرزمینِ ہند پر قدم رکھا تھا[۱]۔

---

* محقق و مصنف، مقیم لاہور

شملہ وفد کی مخالفت کے پس منظر پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو اس موقعے پر سرسید احمد خان نے یہ بھانپ لیا تھا کہ ''مسلم وجود'' کو اب سخت خطرات کا سامنا ہو گا۔ اگر آپ سید احمد خان کی تقاریر کا مطالعہ کریں تو وہ اس خدشے کا اظہار کانگریس کے وجود میں آنے سے قبل ہی کر چکے تھے۔

دراصل یہ سرسید احمد خان کی سیاسی بصیرت کا ایک باکمال نمونہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت کے خطرے سے بجا طور پر آگاہ کر دیا تھا۔

دراصل معاملہ یہ تھا کہ کانگریس کے پیشِ نظر ''متحدہ ہند'' کا بڑا واضح تصور ابتدا ہی سے موجود تھا اور اس کی بڑی واضح خواہش تھی کہ مسلمان بھی کانگریس میں جذب ہو جائیں تاکہ ہند کی آزادی کے لیے جو بھی صدا بلند کی جائے وہ تمام ''ہندوستانیوں'' کی آواز سمجھی جائے۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ کانگریس کے بارے میں جو آواز سید احمد خان نے بلند کی وہ تمام ہند میں گونج اٹھی۔ شملہ وفد کی تشکیل اور آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام پر ایک نظر ڈالنے سے قبل یہ اشد ضروری ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ آخر مسلمانوں کو ایک علاحدہ قومی تنظیم بنانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت نے کانگریس سے علاحدگی کیوں اختیار کی؟

میری رائے میں اس کا ایک بنیادی سبب بی جی تلک کی گئو رکھشنی سبھا، اردو ہندی تنازع، مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی میں ان کے حقوق سے محروم رکھنا، ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ تعصب آمیز سلوک اور بالخصوص تقسیمِ بنگال کی بھرپور مخالفت تھا۔

جب ۱۸۸۵ء میں اے او ہیوم (A.O.Hume) کے ہاتھوں کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو مسلمانوں میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس ضمن میں سید احمد خان کا مسلمانوں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ کانگریس سے علاحدہ رہیں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت یا بڑی تعداد کانگریس میں شامل ہو جاتی تو کیا پاکستان کا قیام ممکن تھا؟ ایسی صورت میں کانگریس برطانوی حکمرانوں کو یہ بات باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ اس کے تمام مطالبات ''ہندوستانیوں'' کے مطالبات ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کانگریس اس کوشش میں سرگرداں رہی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہی ہے۔ بمبئی کے ایک کانگریسی مسلمان قاضی کبیر الدین احمد نے مولانا ظفر علی خان کے مجلہ دکن ریویو

کے شمارے میں ایک مضمون ''انڈین نیشنل کانگریس اور مسلمانانِ ہند'' کے زیرِ عنوان لکھا تھا۔ ۱۰ صفحات کے اس طویل مضمون میں انھوں نے اول تو اس بات کا جائزہ لیا تھا کہ آخر مسلمان کانگریس کی کارروائیوں میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ قاضی کبیر الدین نے دو وجوہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا تھا، اول یہ کہ اب تک کانگریس کے اغراض و مقاصد اور اس کے منافع مسلمانوں تک پہنچائے نہیں گئے۔ دوم انھوں نے یہ الزام عائد کیا کہ ''بہت سے قومی خیر خواہی کے مدعی اپنے اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو کانگریس سے بد ظن اور متنفر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے''[۲]۔

قاضی کبیر الدین کے اس مضمون سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کانگریس مسلمانوں کو اپنا حصہ بنانے کے لیے کس تک کوشاں تھی کہ اس کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۴ء (بمبئی) میں اس معاملے پر تفصیلی بحث ہوئی تھی۔

اس سلسلے میں قارئین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ضروری ہے کہ برِ عظیم میں مسلمانوں کی حد درجہ پس ماندگی ہندوؤں میں بڑھتے ہوئے مذہبی جنون تقسیم بنگال کے معاملے میں مسلمانوں کو دیوار سے لگا دینے کی حکومتی پالیسی نیز ان کا یہ خوف کہ اگر یہاں نامزدگی کی بجائے انتخابی سلسلہ رائج کر دیا گیا تو بقول سید احمد خان ''ایک پارلیمنٹ کے قیام کی صورت میں مسلمانوں کی حالت ویسی ہی ہوگی جیسی برطانوی پارلیمنٹ میں آئرش ممبروں کی ہوگی''۔ ان تمام عوامل نے شملہ وفد کی تشکیل کی راہ ہموار کی تھی۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے بھی ان ہی امور پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> اگر کانگریس کے لیڈر مسلمانوں کے اسلاف پر حملہ کرنا چھوڑ دیں اور سیواجی کی برسی کا دل شکن اور تفرقہ انداز روزولیوشن پاس کر کے مسلمانوں کی دل آزاری نہ کریں۔ اگر کانگریس والے مسلمانوں کے حقوق کا انصافانہ خیال رکھیں، زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر نیز عام ہندوستانی زبان یعنی اردو کے مقابلے میں ہندی کو عدالتوں میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں، تقسیمِ بنگال کی منصفانہ پالیسی کی مخالفت مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے نہ کریں اور آپس کے جھگڑوں کو قطع کر دیں تو کون مسلمان ایسا ہے جو کانگریس کے مقاصد سے بیزار ہو[۳]۔

شملہ وفد کی تشکیل کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہفت روزہ وطن نے لکھا تھا کہ:

یکم اکتوبر کو مسلمانوں کا میموریل (Memorial) بخدمتِ وائسرائے ہند پیش ہو گا کہ ہندوستان کی آئندہ لیجیسلیٹو کونسل میں دیسی ممبروں کا جو اضافہ ہونے والا ہے اس میں اس قدر مسلمان لیے جائیں کہ اس مجلسِ اعلیٰ میں مسلمان ممبروں کا شمار مسلمانوں کی آبادی کے موافق ہو جائے۔

اس مطالبے پر ہندوؤں کے رد عمل اور ''ہندو ذہنیت'' کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ہفت روزہ وطن نے لکھا تھا:

ہمارے برادرانِ یوسف کا پرانا طریقہ ہے کہ اپنے مطلب کے لیے مسلمانوں کو اپنے ساتھ متحد کرنے کے وقت تو ایسی باتیں کرتے اور للّو پٹو کرتے ہیں کہ گویا ان سے زیادہ مسلمانوں کا کوئی خیر اندیش اور فلاح خواہ ہی نہیں ہے، لیکن جب کبھی حقوق کا معاملہ آکر پڑتا ہے ان کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ یہ لوگ چپ بیٹھے رہیں اور جو کچھ ہے وہ سب ہمیں ہی مل جائے اور اگر خدانخواستہ مسلمانوں کی طرف سے مطالبہ کی کوئی دھیمی سی آواز بلند ہوئی تو ہر طرف سے ایسی کائیں کائیں ہونے لگتی ہے کہ کان پڑی آواز ہی سنائی نہیں دیتی اور ہر طرح یہی کوشش ہوتی ہے کہ آواز بولنے والے کے گلے ہی میں رُک کر رہ جائے اور کسی طرح گورنمنٹ کے کانوں تک نہ پہنچے۔

بھلا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ لیجیسلیٹو کونسل جیسی اعلیٰ مجلس میں مسلمان اپنے قومی دکھ اور ممبروں کی زیادتی کا چرچا زبان پر نہ لائیں اور مخالف جماعت کے دل میں چھری کٹاری نہ چلنے لگیں۔ اگرچہ یہ وہ زمانہ ہے کہ ہندوؤں کی مقتدر پارٹی جو ہمیشہ مسلمانوں کو در باطن نقصان پہنچانے کے درپے رہتی ہے ان دنوں بہ ضرورت و مصلحت ان کو صدائے اتحاد و امداد دے رہی ہے۔

شملہ وفد کی عرض داشت کا مسودہ آنریبل نواب عمادالملک، سید حسین بلگرامی ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم قلمرو آصفیہ کی دماغ سوزی اور محنتِ شاقہ کا نتیجہ تھا۔

ذکاء اللہ کا بھی یہی خیال تھا کہ: نواب محسن الملک نے ایڈریس سید حسین کو حیدرآباد دکن سے بمبئی بلوا کر لکھوایا تھا جن سے بہتر لکھنے والا کوئی مسلمان ہندوستان بھر میں دوسرا نہ تھا[۴]۔

یہاں اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسپل آرچ بولڈ (Arch Bold) نے نواب محسن الملک کو ایک مسودہ تیار کر کے بھی دیا تھا مگر انھوں نے اس کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔

شملہ وفد کی تشکیل کے سلسلے میں نواب محسن الملک کی خدمات کو سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں کی جانے والی تگ و دو ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔ یہ حقیقت قابلِ ذکر ہے کہ محسن الملک نے محض پانچ چھے ہفتوں میں اس کام کو سرانجام دیا تھا۔ شملہ وفد کے شرکاء کے انتخاب کے بارے میں اس اہم بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ اس وفد کی سربراہی سر آغا خان نے کی تھی اور اس میں ۳۴ دیگر ارکان شامل تھے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۰۶ء کو ہفت روزہ وطن نے ایک فہرست شائع کی تھی جس کے مطابق نواب صاحب ڈھاکا (مشرقی بنگال و آسام)، سید نواب علی چودھری (مغربی بنگال)، نواب امیر حسین خان و خان بہادر مرزا شجاعت علی بیگ، نواب نصیر حسین خیال، پرنس بختیار شاہ (بہار)، شرف الدین (بیرسٹر ایٹ لا) سید علی امام، خان بہادر، سرفراز حسین (اودھ)، نبی اللہ (بیرسٹر)، مولوی احتشام علی، شاہد حسین تعلقہ دار (بیرسٹر)، راجا نوشاد علی خان (آگرہ)، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، ممتاز الدولہ نواب فیاض علی خان، حاجی اسماعیل خان، خان بہادر نواب مزمل اللہ خان، صاحب زادہ آفتاب احمد خان، سید عبدالرؤف (بیرسٹر)، مولوی سید کرامت حسین (بیرسٹر)، حکیم محمد اجمل خان، نواب فتح علی خان قزلباش، کرنل عمر حیات خان، راجہ جہاں داد خان، محمد شفیع (بیرسٹر)، میاں شاہ دین (بیرسٹر)، خواجہ یوسف شاہ، شیخ غلام صادق (پنجاب)، ایچ ایم ملک (ممالک متوسط) (بمبئی) آدم جی پیر بھائی، زین اللہ دروس، نواب زادہ نصر اللہ خان، سید سردار علی، مولوی رفیع الدین (بیرسٹر) اور سندھ سے خان بہادر سردار یعقوب خان وزیر خیر پور کے نام لکھنؤ کے اجلاس میں منظور کیے گئے تھے۔

بعد ازاں اس فہرست میں جن حضرات کے نام شامل کیے گئے تھے ان میں (۱) منشی احتشام علی رئیس کاکوری ضلع لکھنؤ (۲) منشی عبدالسلام خان (پنشنر جج رامپور) (۳) مولوی حبیب الرحمن (رئیس بھیکم پور) (۴) خلیفہ سید محمد حسین (کونسل ممبر ریاست پٹیالا) (۵) کرنل عبدالمجید خان (وزیر خارجہ پٹیالا) (۶) قاضی غیاث الدین (پیر علاقہ بھروچ ضلع بمبئی) (۷) راجہ جہاں داد خان، اور نواب فتح علی خان قزلباش شامل تھے۔

ہفت روزہ وطن نے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ اگرچہ فہرست میں نواب سلیم اللہ خان کا نام بھی شامل تھا لیکن چوں کہ وہ کئی ہفتوں سے علیل تھے، لہٰذا وہ شرکت نہ کر سکے۔

اس ضمن میں ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ درجِ بالا ناموں کی یہ فہرست ہفت روزہ وطن نے ۲۸ ستمبر ۱۹۰۶ء کو شائع کی تھی جب کہ ڈاکٹر رضی واسطی نے اپنی کتاب میں بطور ضمیمہ ۳۵ ارکان کی جو فہرست شائع کی ہے اس میں (۱) سید الہ داد شاہ، (۲) خان بہادر احمد محی الدین کے نام شامل نہیں۔ اسی طرح وطن کی فراہم کردہ فہرست میں خان بہادر سردار یعقوب خان (وزیر ریاست خیر پور) نواب زادہ نصر اللہ خان، زین الادروس، قاضی

غیاث الدین (پیر علاقہ بھروچ ضلع بمبئی) اور شاہد حسین، بیرسٹر (تعلقہ دار) نے شملہ وفد میں شرکت نہیں کی تھی[۵]۔

لارڈ منٹو سے ملاقات کرنے والے شملہ وفد کے اراکین کو مسلم معاشرے اور حکومتی نگاہوں میں ایک بہت اہم مقام حاصل تھا۔ سید احمد خان کے جاری کردہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے شملہ وفد پر کانگریسی اخبارات کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> اس ڈیپوٹیشن کے تمام ممبر ملک، قوم اور گورنمنٹ میں اعلیٰ درجے اور اقتدار رکھتے ہیں اور جن پر کیا بہ لحاظِ وجاہتِ ظاہری اور لیاقتِ صوری و معنوی اور کیا بہ اعتبارِ اعزازی سرکاری و اعتمادِ قومی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو بجا طور پر فخر و ناز ہو سکتا ہے جس کی تائید ان مختلف مقامات کے متعدد جلسوں سے ہوتی ہے جنھوں نے ڈیپوٹیشن کی کارروائیوں پر اپنا پورا اعتماد اور اطمینان ظاہر کیا اور شکریہ کے تار بھیجے[۶]۔

شملہ وفد کے اراکین کے سلسلے میں مدراس کے سید محمد (ممبر کونسل، مدراس) کا تذکرہ بے حد ضروری ہے جن کا شمار انڈین نیشنل کانگریس کے بہت بڑے حمایتیوں میں ہوتا تھا۔ ابتدا میں یہ طے پایا تھا کہ اگر سر آغا خان وفد کی قیادت کسی سبب نہ کر سکے تو ان کی عدم موجودگی میں سید محمد یہ فرض سرانجام دیں گے، لیکن بہ وجوہ ایسا نہ ہو سکا۔

جب سر آغا خان شملہ پہنچ گئے تو سید محمد کے شملہ وفد کی قیادت کا معاملہ پس پشت چلا گیا۔

اب ہندو اخبارات سید محمد کی شملہ وفد میں عدم شرکت کو اسے وفد کے نامکمل ہونے کا ثبوت بتلانے میں لگ گئے۔

بعض ہندو اخبارات نے سید محمد کی عدم شمولیت کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ گو مجوزانِ میموریل نے اس کی عبارت میں سید صاحب کی تحریک پر بہت کچھ ردوبدل کر دیا تھا مگر پھر بھی انھوں نے کانگریسی تعلق کی وجہ سے اس وقت تک اسلامی عرض داشت میں شامل ہونا منظور نہ کیا جب تک کہ مسلمان کانگریس کی ضرورت کے کم از کم اصولی طور پر معترف نہ ہو جائیں۔

اس معاملے پر ہفت روزہ وطن کا موقف یہ تھا کہ:

> ممکن ہے یہ خیال صحیح ہو کیوں کہ سید محمد صاحب کے اکثر خیالات و اظہارات پر اسلامی پبلک کو اب تک کئی مرتبہ ناپسندیدگی کے اظہار کی ضرورت پیش آچکی ہے۔ مگر وطن کی رائے میں اس موقع پر بڑی وجہ عدم شرکت کی یہی ہوئی ہو گی کہ سر آغا خان صاحب کے پہنچ جانے کی

وجہ سے محض لیڈری کے لیے ان کو مدراس سے تشریف لانے کی احتیاج نہ رہ گئی تھی[۷]۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ وطن نے اپنی اس غلطی کا اعتراف کیا تھا کہ:

وطن کی غلطی تھی کہ آنریبل نواب سید محمد کو جو کہ شملہ ہی میں تھے لیکن ان کو مدراس میں بتلایا گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ہندو اخبارات نے نواب سید محمد کی شملہ وفد میں عدم شمولیت پر خوب شور وغل مچایا تھا اور بقول وطن ان کی عدم شرکت پر پھولے نہیں سماتے تھے لیکن

نادان یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے تو مسلمانوں کی عرض داشت کی وجوہات کی بیش از پیش تائید ہوگئی۔ عرض داشت میں کھلم کھلا طور پر یہ عرض کیا گیا تھا کہ جو شاذ و نادر مسلمان موجودہ طریق (نامزدگی) سے کونسلوں کی ممبری کے لیے منتخب ہوتے ہیں وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے نائب نہیں کہلا سکتے، بلکہ در حقیقت ان کی آراء اور خیالات کی وہی جماعت مالک ہوتی ہے جس کے ناجائز غلبہ سے بچائے جانے کی التجا لے کر مسلمان اپنے فرمانروا کے حضور میں حاضر ہوئے تھے۔ اس حقیقتِ حال کو سید محمد کی علاحدگی نے کامل وضاحت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے اور بلاشبہ اس بدیہی مثال نے نواب وائسرائے صاحب کو دیگر معاملات کی طرح انتخابی مسئلہ کے متعلق اپنی رائے کے اظہار اور اسلامی حقوق کے اعترافِ کامل میں ایک لمحہ کے لیے بھی التوا کرنے کی اجازت نہ دی[۸]۔

نواب سید محمد کی شملہ وفد میں عدم شمولیت کے حوالے سے ہفت روزہ وطن کی مانند علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا بھی یہی خیال تھا کہ بعض کانگریسی اخبارات یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں مسلمان ڈیپوٹیشن میں اس لیے شامل نہیں ہوئے تھے کہ وہ بلاواسطہ کانگریسی اس قسم کی کارروائیوں کو کچھ مفید نہیں سمجھتے لیکن:

ہم نہیں سمجھتے کہ جو لوگ ڈیپوٹیشن میں شریک نہیں ہوئے ان کی عدم شرکت سے یہی نتیجہ کیوں اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ ایڈریس اور ڈیپوٹیشن کے خلاف تھے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ایک دل چسپ سوال اٹھایا کہ کیا سارے ہندوستان کے مسلمان شملہ جاتے تب ہی وہ رائے عامہ کا مظہر خیال کیا جاتا؟ شملہ وفد کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس میں شریک ارکان کی اکثریت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر ہونے کے ناطے علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھی، نیز ان کی کافی تعداد کسی نہ کسی سیاسی تنظیم یا مسلم انجمنوں سے منسلک تھی۔

مشہور محبِ وطن بنگالی مصنف ڈاکٹر مطیع الرحمن نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ شملہ وفد کی طرف سے پیش کردہ عرض داشت پر پشاور سے لے کر مدراس تک کے چودہ لاکھ اکسٹھ ہزار ایک سو تراسی (۱۴۶۱۱۸۳) مسلمانوں کے دستخط موجود تھے[۹]۔

ابھی تک اس سلسلے میں ہمارے سامنے کوئی دستاویزی ثبوت نہیں آیا تھا لیکن خوش قسمتی سے یہ دستاویزی ثبوت ہفت روزہ وطن کے صفحات پر موجود ہے۔ وطن میں ایک خبر شائع ہوئی کہ:

> مسلمانانِ پشاور نے ۱۴ ستمبر ۱۹۰۶ء کو کورٹوں میں مسلمان ممبروں کی کافی تعداد لیے جانے کی درخواست کی تائید میں ایک عظیم الشّان جلسہ کیا اور دس ہزار آدمیوں کے دستخط اسلامی میموریل کی تائید میں نواب محسن الملک کو بتاریخ ۱۸ ستمبر بھیجے گئے۔
>
> مقررین نے اس سلوک کی بھی اچھی طرح سے وضاحت کی جو اب تک اہل ہنود کا ہم مسلمانوں سے رہا ہے اور جس کی ان کے اور طاقت ور ہو جانے کی صورت میں توقع رکھی جانی چاہیے[۱۰]۔

وطن نے شملہ وفد کے مطالبات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کے کل ۱۷ ضمن رکھے گئے تھے جن کا لبِ لباب حسبِ ذیل ہے:

شروع میں ان احسانات و برکات کا ذکر کیا گیا جن سے عہدِ انگلشیہ میں براعظم ہندوستان کے کروڑ ہا باشندے مستفید ہوئے ہیں اور اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ محض اسی مبارک عہد کی بدولت بدامنی و خانہ جنگی کا خاتمہ ہو کر فلاح و امن اور ترقی و تمدن کا دور دورہ شروع ہوا۔ ہندوستان کی آبادی میں سوا چھے کروڑ مسلمانوں کو اپنی آبادی وغیرہ کے لحاظ سے جو نمایاں وجاہت حاصل ہے اس کی یاددہانی کرا کے کہا گیا کہ اب مسلمانوں میں بھی بیداری کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اب تک اپنے حکمرانوں کے انصاف و کرم پر بھروسا کر کے اپنے نیک و بد کو بالکل ان کے ہاتھوں میں چھوڑے رہے اور اپنے دعاوی و حقوق کو آرزو مندی افزا طریقے سے پیش کرنے سے بااحتیاط محترز رہے۔

مگر اب سرکردگانِ ملت کی اس کامل خواہش کے باوصف کہ مسلمان برابر اس قدیم روش پر قائم رہیں جدید حالاتِ زمانہ نے کُل قوم اور خاص کر نوجوانانِ ملت میں اس قسم کے جذبات پیدا کر دیے ہیں کہ اگر ان کی معروضات پر بروقت توجہ نہ ہوئی تو اندیشہ ہے کہ وہ بعض خاص حالات میں اعتدال و سلامت روی کی حد سے متجاوز ہو جائیں۔

وطن نے جداگانہ انتخاب کے بارے میں وائسرائے ہند کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> حضور وائسرائے ہمیں یہ کہنے سے امید ہے معاف فرمائیں گے کہ یورپین طرز کی انتخابی مجالس مشرقی اقوام کے مذاق و خیالات کے بالکل متضاد ہیں اور ہماری قوم کے اکثر اہل الرائے ان کو ہندوستان کی موجودہ سوشل، مذہبی اور سیاسی حالات کے لحاظ سے اس ملک کے لیے بالکل مناسبِ حال نہیں سمجھتے۔ تاہم چوں کہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی طبیعت اور صدہا سال کی تربیت و پرورش سے مجبور ہو کر اس طریقے کو یہاں بھی رائج کر دیا ہے اور دن بہ دن اس کا دائرہ وسیع کرتے جارہے ہیں۔ ہم مسلمان اپنے حقوق و مفادات کی نگہ داشت کی ضرورت سے مجبور ہو کر اب اور زیادہ ان مجالس میں اپنا واجب حصہ پانے کی طرف سے لاپروا نہیں رہ سکتے۔ ہم مسلمان دیگر اقوام سے چند ممتاز و متغائر اغراض بھی رکھتے ہیں، لیکن ان مجالس میں مناسب حصہ نہ رکھنے کی وجہ سے اب تک سخت نقصان اٹھاتے رہے ہیں۔ انتخابی مجالس میں واجب حصہ ملنے کے متعلق عرض حال کرنے سے پیشتر یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہر قوم کی سیاسی و ملکی وجاہت اور عزت و شوکت کا بڑا دارومدار اس پر بھی ہے کہ سرکاری ملازمت میں اسے واجب دخل حاصل ہو۔ مگر افسوس اس معاملے میں بھی ہم مسلمان اپنے حق سے بہت کچھ محروم رہے ہیں۔ پس ہماری سب سے اول یہ التجا ہے کہ حضور ممدوح اس مضمون کے حتمی و تائیدی احکام صادر فرمائیں کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی گزیٹڈ سبارڈینیٹ اور دیگر اسامیوں میں سے مسلمانوں کو بھی ان کا واجب حصہ بااحتیاط تمام ملتا رہے۔ اس مضمون کے احکام پہلے بھی مختلف لوکل گورنمنٹوں کی طرف سے صادر ہو چکے ہیں لیکن اس حجت پر کہ قابل مسلمان بہم نہیں پہنچتے ان کی کماحقہ تعمیل نہیں ہوتی رہی۔ حالاں کہ یہ حجت اب بالکل ناقابل پذیرائی ہے۔ اگر فی الواقع مسلمانوں کو ملازمت دینے کا منشا ہو جو منشا افسوس ہے کہ ایسے محکموں میں جہاں تقریباً کلہم ہندو موجود ہوں کبھی نہیں پایا جاتا، تو یہ امر واقع ہے کہ سرکار جس قدر مسلمانوں کو اسامیاں دے سکتی ہے قابل مسلمان ان کی تعداد سے بدرجہا زیادہ اس وقت ملک میں موجود ہیں۔
>
> انتخابی مجالس کے متعلق ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ یہی نہیں کہ انتخابی سیڑھی کے زینے ہیں بلکہ باشندوں کے امن و راحت اور صحت کو بھی کفیل ہیں مگر

ایسی ضروری اور ابتدائی مجالس میں بھی حضور والا ہم مسلمانوں کی پوزیشن نہایت ہی قابل رحم ہے اور اس امر کا بالعموم کوئی انتظام نہیں کہ مسلمانوں کو ان میں ضرور کم از کم اس قدر حصہ ملے۔ بعض میونسپلٹیوں میں یہ قاعدہ ہے کہ نصف ممبر مسلمان اور نصف ہندو ہوں۔ علی گڑھ میں یہی قاعدہ ہے، مگر اکثر مقامات میں مسلمانوں کے حقوق کی نگہ داشت کا کوئی انتظام نہیں۔ پس ہماری استدعا ہے کہ اس قسم کی تعیین مسلمانوں کی آبادی اور وجاہت وغیرہ کے لحاظ سے ہر بورڈ کے متعلق کر دی جائے۔

اسی طرح یونی ورسٹیوں کی سینیٹوں اور سنڈیکیٹوں میں بھی مسلمانوں کی ایک تعداد معین کر دی جائے جو انتخاب یا نامزدگی سے پوری ہوا کرے۔ پراونشل کونسلوں کے متعلق ہماری التجا ہے کہ ان میں بھی ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کی مانند مسلمان ممبروں کی تعداد صوبہ وار مقرر و محدود کر دی جائے اور ان ممبروں کے انتخاب کا مجاز میونسپلٹوں اور ڈسٹرکٹ و لوکل بورڈوں کے مسلمان ممبروں اور یونی ورسٹی کے مسلمان گریجوایٹوں کی جماعت کو کیا جائے۔ اور اس کے متعلق ضروری قواعد وضوابط وضع فرمائے جائیں۔

امپرئیل لیجیسلیٹو کونسل میں بھی مسلمانوں کو حصہ واجب ملنا اشد ضروریات میں سے ہے اور اس کے متعلق ہم یہ تجاویز باادب پیش کرتے ہیں (۱) اس کونسل کے ہر چار ممبروں میں سے ایک ضرور مسلمان ہوا کرے۔ (۲) جہاں تک ممکن ہو نامزدگی پر طریقِ انتخاب کو ترجیح دی جائے یا کم از کم مسلمان ممبروں کا بڑا حصہ بذریعہ انتخاب لیا جائے۔ (۳) اس کونسل کے ممبروں کے انتخاب کا اختیار تمام صوبوں کی پراونشل کونسلوں کے مسلمان ممبروں اور یونیو سیٹوں کے مسلمان فیلو صاحبان کو دیا جائے اور اس کے لیے مناسب ضابطہ وضع کیا جائے۔

ہم نے جو طریقِ انتخاب عرض کیا ہے ممکن ہے وہ بھی خالی از سقم نہ ہو۔ لیکن ہمیں اس تھوڑے سے عرصے میں جو چند طریقے سوجھے یہ ان میں افضل ترین ہے تاہم اگر سرکار چاہے تو کوئی اور طریقہ سوچ سکتی ہے۔ ہماری استدعا صرف یہ ہے کہ ہر حالت میں انتخاب ملک کے معزز اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی وساطت سے ہو۔ مسلمانانِ ہندوستان کو اس امر کی بھی عام شکایت ہے کہ ملک کو ہائی کورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان جج شاذ و نادر مقرر ہوتے ہیں۔ جب سے یہ عدالتیں قائم ہوئی ہیں صرف تین مسلمانوں کو یہ عہدہ ملا ہے اور

خوشی کا مقام ہے کہ ہر ایک کو اعتراف ہے کہ تینوں نے اپنے فرائض کو نہایت قابلیت و لیاقت اور عمدگی سے انجام دیا۔ جن کی یہ نمایاں کارگزاری ہمیں یہ استدعا کرنے کی جرأت دلاتی ہے کہ ہر عدالتِ اعلیٰ میں ضرور کم از کم ایک مسلمان جج ہوا کرے۔ اس عہدے کے قابل قانون دان مسلمانوں میں سے ہمیشہ بلا دقّت مل سکیں گے اور بفرضِ محال اگر ایک صوبے سے نہ ملیں تو دوسرے صوبے سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ پنجاب چیف کورٹ میں برسوں سے ایک بنگالی جج موجود ہے۔

اس امر کا بھی کچھ عرصے سے چرچا سنا جاتا ہے کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل اور وزیر ہند کی کونسل میں ایک یا زیادہ دیسی ممبر لیے جائیں گے۔ اگر واقعی یہ خبر درست ہو تو ہم باادب عرض کریں گے کہ اس معاملے میں بھی مسلمانوں کے حقوق نظر انداز نہ فرمائے جائیں۔ متعہد اور غیر متعہد صیغوں کے ملازموں میں سے ایک سے زیادہ مسلمان ایسے مل سکتے ہیں جو ان دونوں کونسلوں کی ممبری کے فرائض کو نمایاں امتیاز کے ساتھ سرانجام دیں گے۔ اس وقت ایک پنشنر جج ہائی کورٹ لندن میں موجود ہے اور اس کی علمیت، تجربہ اور قانونی قابلیت کی دنیا معترف ہے۔ ہماری مراد سید امیر علی صاحب سے ہے، اگر وہ وزیر ہند کی کونسل کے ممبر بنا دیے جائیں تو کل مسلمانانِ ہندوستان اس عزت افزائی کے لیے ممنون ہوں گے۔

بالآخر ایڈریس کے آخر میں استدعا کی گئی کہ مسلمانوں کو علی گڑھ میں اپنی ایک جداگانہ اسلامی یونی ورسٹی قائم کرنے کی اجازت دی جائے"۔

وائسرائے لارڈ منٹو نے شملہ وفد کو جو جواب دیا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وطن نے لکھا تھا کہ:

اسلامی عرض داشت کا نواب وائسرائے نے جو کچھ جواب دیا تھا اس پر کسی طویل ریمارکس کی ضرورت نہیں، اسلامی عرض داشت میں چند معین درخواستیں کامل وضاحت کے پیش کی گئی تھیں۔ حضور ممدوح نے ان میں سے صرف انتخابی مجالس میں مسلمانوں کے حصہ کا ذکر اپنے جواب میں کیا ہے، باقی امور کو نظر انداز کر دیا ہے گو ضمناً ان کی نسبت بھی اس اصولی وعدہ پر ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے گا کچھ نہ کچھ تشفی دلائی گئی ہے۔ بادی النظر میں نواب ممدوح کے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ایسے ملک میں

جہاں بہت سی قومیں آباد ہوتی ہوں ایک قوم سے پختہ وعدہ کرنا گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دینے کا حکم رکھتا ہے۔

اگر مسلمان اب تک اپنے حقوق سے محروم رہے ہیں تو محض اپنی لاپروائی کے طفیل اور اگر آئندہ بھی مہربان سرکار ان کی اغراض کی کماحقہ نگہ داشت نہ کر سکے تو اس کے بھی ذمہ دار خود مسلمان ہوں گے۔ اخبارات اور مجالس کے ذریعے وہ اپنی آواز کو بھی اس قابل بنائیں کہ اس کی سماعت ہو سکے۔ اس کارِ عظیم کو ایک مبارک فال تصور کریں نہ کہ اختتامی کارروائی۔ کانگریس کو ۲۰ سال میں یہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی کہ نائب السلطنت بالمشافہ اس کی معروضات سنیں۔ مسلمانوں کو سیاسی میدان میں قدم رکھتے ہی یہ عزت حاصل ہو جاتی ہے مگر اس کا نیک نتیجہ تب ہی برآمد ہو سکے گا کہ وہ اب اس سلسلے کو برابر جاری رکھیں، اپنی ہر حق تلفی کی فوراً بہ ادب فریاد کریں اور ہر موقعے پر حق رسی کے لیے بطریقِ شائستہ سعی کرنے سے بے فکر نہ رہیں۔ نواب وائسرائے کے جواب کو نہ صرف اکثر مسلمان بلکہ غالباً لنڈن ٹائمز بھی کافی تشفی بخش اور حسبِ توقع نہیں بتائے گا۔ اخبارِ مذکور چاہتا تھا کہ یہ جواب ایسا ہو کہ مسلمانانِ ہند اسے اپنے حق میں ویسی ہی دستاویز سمجھ سکیں جیسا کہ میگنا چارٹر کو انگریز تصور کرتے ہیں مگر وطن کی رائے میں اسے بھی بسا غنیمت سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی کچھ کم نہیں کہ ہماری معروضات مرجعِ اعلیٰ تک تو پہنچ گئی ہیں ان کا قبول کروانا دنوں کا کام نہیں سال ہا سال کی مسلسل جدوجہد اس کے لیے درکار ہو گی۔

ذکاء اللہ نامی ایک شخص نے لارڈ منٹو کے اس جواب کے بارے میں لکھا تھا کہ "اس ایڈریس کا جواب جو لارڈ منٹو نے اپنی زبان فیض ترجمان سے فرمایا اس میں لارڈ لیٹن کی اسپیچوں کے شاعرانہ خیالات کا اور لارڈ کرزن کی اسپیچوں کے شاہانہ خیالات کا لطفِ سخن نہ تھا مگر لارڈ ڈفرن کی اسپیچوں کے دانش مندانہ خیالات کا لطف تھا۔ اس کے ہر فقرے سے دانائی اور نیک خیالی ٹپکتی تھی۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے بھی شملہ وفد کے ایڈریس کے متعلق لکھا تھا کہ:

> پچھلے دنوں جو ڈیپوٹیشن مسلمانوں کی طرف سے حضور وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اپنی معتدل درخواستوں کے پیش کرنے اور دردِ دل بیان کرنے کی عزت اس کو حاصل ہوئی تھی اس پر ہندوستان سے لے کر انگلستان تک کے اخباروں نے اپنی مسرت ظاہر کی ہے اور مسلمانوں کی اس مہتم بالشّان کوشش اور بری از تعصب، مدلل اور مؤدبانہ ایڈریس اور ہز ایکسی لینسی کے معنی خیز اور تشفی بخش جواب کو نہایت وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھا ہے۔

اخبار نے آگے چل کر ایڈریس کے بارے میں لکھا تھا کہ "اس کا لہجہ نہ سخت تھا اور نہ ہی اس میں کسی غیر مسلم قوم کی بُرائی تھی بلکہ خود مسلمانوں نے اپنا عرضِ حال سنجیدگی اور اپنی پوزیشن کے لحاظ سے کیا تھا۔ پھر کیوں نہ گورنمنٹ اس کو مہربانی کی نظر سے دیکھتی[12]۔"

شملہ وفد پر ہندو اخبارات کا ردِّ عمل

شملہ وفد پر ہندو اخبارات نے جو کچھ شور و غل مچایا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں ذکاء اللہ نے لکھا تھا کہ:

> اب اس ڈیپوٹیشن پر مخالف ہندو اخبارات جھوٹ کا طومار باندھ رہے ہیں کہ جب وزیرِ ہند نے کانگریس کے متعلق کچھ کلماتِ خیر کہے تو اینگلو انڈین کو سخت ناگوار گزرے۔ انھوں نے چار پانچ مسلمانوں کو جو گورنمنٹ کی خوشامد کیا کرتے ہیں کہہ دیا کہ اس طرح کا ڈیپوٹیشن بنائیں جس سے وزیرِ ہند پر یہ ظاہر ہو کہ کانگریس کے خلاف مسلمانوں کا ایک مجمعِ کثیر ہے۔

ان ہندو اخبارات نے یہ الزام عائد کیا تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کی طرف سے نہ تھا، بلکہ وہ چند خوشامدی مسلمانوں کا ڈھکوسلا تھا۔

ہندو اخبارات نے یہ مضحکہ خیز کہانی بھی گھڑلی کہ وفد کو وائسرائے نے جو گارڈن پارٹی دی وہ دراصل انگریزوں کو دی گئی تھی، اس میں ان مسلمانوں کو بھی بلالیا جو ڈیپوٹیشن کے ممبر تھے۔

ذکاء اللہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ:

> ایک حکیم کا قول ہے کہ آدمی جب جھوٹ بولے تو پیٹ بھر کر۔ اس قول کے موافق اس جھوٹ بولنے میں یہ کسر باقی رہ گئی کہ یہ نہ لکھا کہ ڈیپوٹیشن کے ممبروں کو بلایا ہی نہیں تھا[13]۔

ہفت روزہ وطن نے اپنے ایک اداریے میں بمبئی کے ایک اخبار ہندو پرکاش جسے بقول وطن "اکثر نہایت متین پرچہ تصور کرتے ہیں نے یہ فریاد کی ہے کہ اب لارڈ منٹو کو اپنے متقدم لارڈ کرزن کی طرح کانگریس کے ڈیپوٹیشن کو شرفِ ملاقات کرنے سے انکار زیبا نہ ہوگا"[14]۔

وطن نے اسی اداریے میں انڈین مرر (Indian Mirror) اور چند ایک اور ہندو اخبارات کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ کسی ایسی جلن کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ ایک طرح سے خوشی کا اظہار کیا ہے"۔

لاہور کے روزنامہ ٹریبیون (Tribune) اور چند ایک اور ہندو اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے وطن نے لکھا تھا کہ انھوں نے:

شملہ وفد کے متعلق چند اور بھی ایسی سفاہتیں دکھائی ہیں جن پر کم ظرف سے کم ظرف کو بھی نادم ہونا چاہیے۔ ان کو ایڈریس میں ہندو مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کا ذکر سخت خار گزرا ہے اور بہت بُری طرح سے دل کے جلے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔

ایسے اخبارات کو جب ملکی معاملات میں ہندو کے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دینے اور ہندو مسلمانوں کے ملکی مفادات کو یکساں بتاتے دیکھا جاتا ہے تو شانِ خدا یاد آجاتی ہے کہ منافقت بھی انسان کو کیسا خود فراموش اور ڈھیٹ بنا دیتی ہے۔

روزنامہ ٹریبیون ایسے متعصب اخبار نے شملہ وفد پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ: مسلمان اعلیٰ جوڈیشل عدالتوں اور دیگر سرکاری ملازمتوں میں کسی خاص رعایت کے طلب گار تھے۔ وطن نے اس الزام کی بلاخوف و جھجک تردید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> مسلمان اب استحقاقاً اس دعوے کو پیش کرتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ جس عہدے کے لیے جیسی قابلیت درکار ہے بے شک ویسی ہی قابلیت کو معیار قرار دیا جائے اور جو مسلمان اس کا اہل ثابت ہو اسے وہ عہدہ دیا جائے۔

ہفت روزہ وطن نے اس سلسلے میں اصل صورتِ حال کی حقیقی تصویر سامنے رکھتے ہوئے جتلا دیا تھا کہ:

> صورتِ حال کچھ ایسی واقع ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں دخیل ہونے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا جس امر واقعہ سے کوئی باخبر انکار نہیں کر سکتا حالاں کہ خود ملک کی بہتری اور حسنِ انتظام اس امر کا متقاضی ہے کہ کسی ایک فریق کو کل کاروبارِ سلطنت کا مالک نہ بننے دیا جائے۔

ہندوؤں کی مخالفت کے سلسلے میں لاہور کے ایک ہندو روزنامہ لائٹ (Light) جو ''مسلمانوں کے قدیم نامہربان'' کالی ناتھ چرن کی ادارت میں شائع ہوتا تھا کا ذکر ضروری ہے۔ لائٹ نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب اور شملہ وفد کے متعلق اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ایک اشاعت میں لکھا تھا:

> لیجیسلیٹو کونسل میں مسلمان ممبروں کے اضافے کے متعلق ان دنوں موچی، دھنیے، نائیوں، بھٹیاروں، مراثیوں اور ڈمخالیوں میں بے طرح کھلبلی مچی ہوئی ہے اور ایک کھچڑی سی پک رہی ہے کہ ہمارے ممبر مجلسِ اعلیٰ میں زیادہ لیے جائیں۔

ہفت روزہ وطن نے لائٹ کے اس طرزِ گفتگو کے بارے میں سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

گویا لائٹ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کی کمیونٹی ایسے ہی رذیل، کمینہ، ناکارہ اور ناقابلِ التفات لوگوں سے بھری پڑی ہے، پھر کیوں کر ایسے لوگ انتخابِ ممبر اور مطالبۂ حقوق کے اہل ہو سکتے ہیں۔ شاید ہم عصر جوش و غیظ کی حالت میں بھول گیا کہ مسلمانوں میں تو اتنے ہی لوگ ہوں گے جتنے آٹے میں نمک۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں جو بلاشرکتِ غیرے تمام حقوق و انعامات کے اپنے آپ کو مستحقِ واحد سمجھتے ہیں، کوئی چمار، بھنگی، سانسی، کنجر وغیرہ جیسی ادنیٰ ترین قوموں کا شمار چھٹے حصے سے کم نہ ہو گا۔

شملہ وفد پر ہندو اور اینگلو انڈین اخبارات بالخصوص سول اینڈ ملٹری گزٹ (لاہور) کے ردِ عمل کا جائزہ لینے کے لیے ایک بنیادی ماخذ حکومتِ پنجاب کی شائع کردہ تاریخی اہمیت کی حامل وہ رپورٹس ہیں جنھیں Punjab Native Newspaper Reports کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان رپورٹوں کا ایک بڑا حصہ لاہور میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہے، لیکن بد قسمتی سے ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء کی جلدیں موجود نہیں۔ پنجاب آرکایوز کے منتظمین سے اس بارے میں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تاہم ہفت روزہ وطن میں شائع شدہ ایک شذرے سے اس صورتِ حال پر تھوڑی سی روشنی ضرور پڑتی ہے۔ وطن نے لکھا تھا:

> ہم عصر سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اسلامی وفد اور لارڈ منٹو کی تقریر پر چند ایسے مضامین شائع کیے ہیں جن سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ آج کل کی ایڈیٹوریل رائے پر ہندو عنصر بہت کچھ غالب آ رہا ہے۔ وہ لکھتا ہے سرکار بے شک مسلمانوں کی حق رسی کرے لیکن وہ اسے نہ بھولے کہ آبادی کا بڑا حصہ ہندو ہی ہیں اور کُل ہندو بنگالی نہیں اس لیے سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا صحیح نہ ہو گا۔

وطن نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اس تحریر پر گرفت کرتے ہوئے صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ:

> یہ شہ ملنے کی دیر تھی کہ ہمارے لالہ بھائیوں کی جولانی کا کوئی حد و حساب نہ رہا اور بعض تو مسلمانوں کو پھر باغی کہنے پر تیار ہو گئے جس کی تائید میں انھوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ مانا انگلستان سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے مگر مسلمانوں کی تو اور بھی مسلمان سلطنتیں موجود ہیں، اس کے برعکس اگر دنیا بھر میں کوئی ہندو سلطنت ہے تو محض انگلستان یعنی کسی اور سلطنت کے ماتحت ایک ہندو متنفس بھی نہیں، پس ہندو کس طرح اپنی واحد محافظ سلطنت کے مخالف ہو سکتے ہیں۔

ہمارے دوستوں نے نکتہ تو خوب سوچا ہے مگر ہم عصر سول کو اپنے دام میں لانے کی غرض سے انھوں نے سارا سچ نہیں کہہ ڈالا جو یہ ہے کہ اب ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد بھی اس عزت کے حصول کے درپے ہے کہ وہ آزاد قومی سلطنتوں کے معاملے میں مسلمانوں سے پھسڈی نہ رہیں کیوں کہ زبانی خواہ کیسا تملق کیا جائے وہ ایک عیسائی بادشاہ کو کبھی اپنا قومی ہندو بادشاہ تصور کرنے پر مائل نہیں ہو سکتی۔

ہم عصر غالباً ایسی ہی خوشامدانہ تحریروں سے خوب دھوکا کھا گیا ہے ورنہ وہ کچھ تحقیق و تجسس سے کام لیتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ دیگر صوبوں کے تعلیم یافتہ ہنود کے سیاسی خیالات بنگالی ہنود سے کچھ مختلف نہیں۔ ہر صوبے کے باشندوں کے خیالات کے درست مظہر وہاں کے اخبارات میں موجود ہیں۔ وہ اس معیار پر اس جماعت کی وفاداری کو پرکھے اور پھر جواب دے کہ کیا وہ مدراس، بمبئی، سندھ، پنجاب، صوبہ جاتِ متحدہ، آسام اور ممالکِ متوسط کے ہندو یا ورنیکولر اخبارات کے خیالات اور تحریروں کو کسی امر میں بھی بنگالی اخبارات کی تحریروں سے مختلف پاتا ہے۔ اگر نہیں تو اسے اپنی غلطی تسلیم کرنی چاہیے[15]۔

کانگریس اور اس کے ہم نوا اخبارات کو شملہ وفد پر درجِ ذیل اعتراضات تھے۔ (۱) مسلمانوں نے بغیر کسی استعانت اور امداد کے تنہا اپنی کوششوں سے اپنے حقوق کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلائی اور وہ کیوں کانگریس کے بھکاری نہ بنے۔ (۲) بعض ہم عصر اخبارات نے شملہ وفد کے متعلق عجیب و غریب مضامین شائع کیے اور اپنے دل سے نئے نئے اتہامات گھڑ گھڑ کر وفد اور اس کے ایڈریس کو بے وقعت بنانا چاہا (۳) ایڈریس میں ہندوؤں سے متعلق جو امور مخالفِ ہنود تھے وہ نکال دیے گئے (۴) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ایڈریس میں ہندوؤں سے متعلق جو امور تھے ان کے اخراج کے بارے میں لکھا تھا کہ: ''اگر ایسا ہوا تو اچھا ہی ہوا، لیکن اس کا علم ہمارے مہربانوں کو کیوں کر ہوا۔ آیا ان ہی کے کسی مخبر نے پوشیدہ طور پر حالات دریافت کیے یا کسی مسلمان صاحب نے چغلی کھائی؟ اگر ایک بھی صحیح ہے تو یہ امر شرم ناک ہے''۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جہاں لاہور کا روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ اپنے اداریوں اور شملہ وفد مخالف مضامین کو اخبار کی زینت بناتا رہا۔ حافظ غلام سرور نے مسلمانانِ ہند کی بھرپور ترجمانی کرتے ہوئے اس اخبار میں ''مدیر کے نام خطوط'' میں ایک دو کالمی طویل خط لکھا تھا۔ اس اہم تاریخی خط کے درج ذیل مندرجات نہایت قابلِ غور اور توجہ طلب ہیں۔

۱) یہ خط شملہ وفد اور لارڈ منٹو کی ملاقات کے ٹھیک پانچ روز بعد چھے اکتوبر کو شائع ہوا تھا، جب کہ ابھی وفد کے خلاف بے جا اعتراضات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

۲) یہ کسی غیر تعلیم یافتہ یا علی گڑھ تحریک سے وابستہ شخص کے جذبات نہیں تھے بلکہ پنجاب سے متعلقہ انڈین سول سروس (I.C.S) کے ایک رکن کے قلم سے نکلے تھے جو ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق مقبوضات Straits Settlements میں اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھا۔

۳) حافظ غلام سرور نے اپنے اس تاریخی خط میں لکھا تھا کہ مسلمانانِ ہند کے قدیم و جدید مکاتبِ فکر پر مشتمل یہ ایک کل ہند وفد (All India Deputatio) تھا۔ شملہ وفد مسلمانوں میں گزشتہ بیس سالہ مغربی تعلیم کے فروغ اور ان کی سیاسی سوچ میں ایک واضح تبدیلی کا عکاس تھا۔

۴) اس اہم خط میں شملہ وفد کے خلاف ہندو اخبارات کی ''فضول بکواس اور کھوکھلی دھمکیوں'' پر تنقید کے علاوہ مسلمانوں کے ''سنجیدہ پن اور محتاط ہوشیاری'' کا بھی کھلے بندوں ذکر کیا گیا تھا۔

۵) غلام سرور نے اس روشن حقیقت کی بھی نشان دہی کی تھی کہ برطانوی سلطنت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم قوم نے حکمرانوں کی بجائے اس نظام کے خلاف آواز بلند کی تھی جو ایک ''غیر ہمدرد اکثریت'' کو یہ موقع فراہم کرتا تھا کہ وہ ''کم تعداد اقلیتوں'' کے حقوق پر ڈاکے ڈال کر اپنا پیٹ بھرتی رہے۔

غلام سرور کا موقف تھا کہ مسلمان امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں اپنی جائز نمائندگی کا مطالبہ جن بنیادوں پر کرتے ہیں انھیں کوئی بھی حکمران نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اول اس قوم کی عددی طاقت ساڑھے چھے کروڑ کے لگ بھگ homogenious افراد پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، جو تمام نماز کے وقت اپنا چہرہ قبلہ رُو رکھتے ہیں اور جنھیں ایک دوسرے کو اپنا بھائی گردانے کی تلقین کی گئی ہے۔ دوم یہ لوگ ایک عالمگیر زبان اردو یا ہندوستانی بولتے ہیں خواہ ان کی مادری زبان پنجابی ہو یا بنگالی، تامل ہو یا گجراتی، اپنے بھائیوں سے اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہیں۔ اردو یا ہندوستانی کو مسلمانانِ عالم کے نزدیک جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ جدہ اور مکہ کے عرب بھی بڑی حد تک اس زبان میں بات چیت کر سکتے ہیں۔

سید احمد خان اور مولانا حالی و نذیر احمد کی تحریریں نہ صرف ہند کے تمام علاقوں میں بلکہ سیلون Straits Settlements آسٹریلیا اور افریقا کے کچھ علاقوں میں بھی پڑھی جاتی ہیں۔ سوم ہند میں مسلم قوم کی ''سیاسی قوت'' اور اہمیت ہندوؤں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہندو ایک تنہا قوم ہیں اور جو محض ہند تک محدود ہیں۔ ان کا کوئی

بھی ہم مذہب ایران، عرب، افغانستان یا چین میں آباد نہیں ہے۔ ہندو برعظیم کی چار دیواری میں جتنا مرضی چاہے شور مچالیں لیکن باہر کی دنیا میں ان کی آواز بالکل تنہا اور اجنبی ہے۔

ہندو زمانۂ قریب تک سمندر عبور کرنا مذہبی اعتبار سے گناہ سمجھتے تھے اور اگر وہ سمندری سفر اختیار بھی کرتا تو محض دولت کی خاطر۔ اس کے برعکس مسلمان بلاخوف وخطر سمندری موجوں سے کھیلتے رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ وہ بیرونِ ہند مسلم ممالک کے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ کوئی بھی حکومت ان کے دلوں سے ہمدردی کے ان جذبات کو ختم نہیں کر سکتی، کیوں کہ ''اسلامی جمہوریت'' دریاؤں، پہاڑوں اور سمندروں کی حدود سے ماورا ہے۔

غلام سرور نے اپنے خط کے آخر میں ایک اہم بات یہ لکھی تھی کہ چوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت مغل حکمرانوں سے چھینی تھی نیز یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغل حکومت نے انگریزوں کے ساتھ باعزت مہمانوں کا سا سلوک کیا تھا اور بعض معاملات میں ان کے ساتھ دیگر یورپی اقوام کے مقابلے میں ترجیحی سلوک کیا تھا۔

اندریں حالات اگر کوئی ہندو اب بھی اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق نظر انداز کیے جاسکتے ہیں تو اسے اس سوچ کو ترک کر دینا ہوگا۔ خاموشی کی مہر اب ٹوٹ چکی ہے، اب اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمان ایک منفرد قوم ہیں اور اب تک ان کے حقوق پر بدیں وجہ زَد پڑی، اب تک وہ معمولی نمائندگی سے محروم رکھے گئے ہیں۔

آخر میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندہ مقیم کلکتہ کے ۵/اکتوبر کے مراسلے کا تذکرہ موزوں ترین ہوگا۔ نمائندے نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کے وفد نے لارڈ منٹو سے ملاقات کے بعد تین چار گھنٹے کی ایک غیر رسمی ملاقات میں ایک مرکزی ایسوسی ایشن کے قیام پر غور وخوض کیا، نیز انھوں نے اپنے اس عزمِ مصمم کا اظہار کیا کہ وہ اب اپنی سستی اور کاہلی کو دور کریں گے۔ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ایسوسی ایشن کی تشکیل کا کام فوری طور پر شروع کر دیا جائے۔ لیکن نوجوان نسل جسے آئینی معاملات میں کچھ شدھ بدھ حاصل تھی یہ مشورہ دیا کہ یہ معاملہ دسمبر میں ڈھاکا میں ہونے والی ایجوکیشنل کانفرنس تک ملتوی کر دیا جائے۔ نواب سلیم اللہ خان کی پیش کردہ مسلم آل انڈیا کنفیڈریسی اسکیم پر غور وخوص ہونا چاہیے[۱۶]۔

کیا شملہ وفد انگریزوں کی شہ پر ترتیب دیا گیا تھا؟ اس کی تردید کے لیے ہم اس دور کے معاصرین کے خیالات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں:

شملہ وفد کے سلسلے میں خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے درجِ ذیل نظم لکھی تھی:

اہلِ اسلام کی طرف سے حضور
ہے گزارش یہی بصد زاری

سلطنت معدلت پہ ہے مبنی
ہے رعیت مطیعِ سرکاری

خوار ہیں آج کل مسلماں سب
جان سے ہو رہے ہیں یہ عاری

گو کہ تعلیم کی نہیں ہے کمی
ان میں از فضلِ ایزدِ باری

اس پہ بھی نوکری نہیں ملتی
منحرف ان سے سب ہیں درباری

ان سے لڑتے ہیں اس طرح اغیار
جیسے یونانیوں سے بلغاری

مٹتے جاتے ہیں سب حقوق ان کے
زخم دل پر لگے نہ کیوں کاری

کشتی ان کی پھنسی ہے دَل دَل میں
کوئی کرتا نہیں ہے اب یاری

کوئی سنتا نہیں ہے کانوں کان
چیختے ہیں اگرچہ اخباری

انتخاب ان کے واسطے ہے مضر
سخت تراس میں ان کو دشواری

آفسوں میں اگر یہ جاتے ہیں
کوئی کرتا نہیں مددگاری

منھ بنا کر یہ کہتے ہیں لالہ
توند دولت سے جن کی ہے بھاری

نہیں دفتر میں ہے جگہ خالی
آج کل ہے یہ سخت دشواری

بھرتی ہو جاتے ہیں مگر ہندو
لکھنے پڑھنے سے خواہ ہوں عاری

ہر جگہ ہم ذلیل ہوتے ہیں
ہے کوئی حدِّ ذلت و خواری

اس سے افلاس بڑھتا جاتا ہے
پھیلتی جاتی ہے یہ بیماری

کوئی دیتا نہیں دوا ہم کو
نہ کوئی کرتا ہے خبرداری

مفلسی اور قحط سالی سے
چھین لی بے زری نے زرداری

کچھ تجارت بھی اب نہیں چلتی
بھوکے مرتے ہیں سارے بیوپاری

دشمن اہلِ زمانہ ہیں اپنے
ناموافق سپہر زنگاری

وجہ یہ ہے کہ اب تعصب کی
غیر قوموں نے کی ہے تیاری

وقت یہ ہے کہ سلطنت اٹھ کر
چیونٹیوں کی کرے طرف داری

پیس ڈالیں نہ فیلِ مست انھیں
کیوں کہ سب منھ چڑھے ہیں سرکاری

اب مسلماں بھی خواب سے چونکے
ان میں پیدا ہوئی ہے بیداری

آج تک یہ انھیں بھروسا تھا
فیضِ سرکار سب پہ ہے جاری

مگر اب حالتِ زمانہ نے
نوجوانوں کو دی ہے ہشیاری

اوس خموشی کو جس میں نقصان ہو
وہ سمجھتے نہیں وفاداری

ہو کے مجبور اس ضرورت سے
عرض کرتے ہیں یہ بنا چاری

انتخابِ مجالس ایسا ہے
ہند کے بھس میں جیسے چنگاری

بات یہ ہے کہ جس قدر سرکار
دے سکے اُن کو نوکری بھاری

ملک میں ایسے لوگ ہیں موجود
علم و تہذیب سے نہیں عاری

ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل
ابتدائی یہ عہدے سرکاری

ہم سے خالی ہیں صاف وائے نصیب
قوم کی کس طرح ہو غم خواری

ہم مسلمانوں کے پوزیشن کی
آپ کو چاہیے ہے دل داری

آج کونسل میں بھی نہیں کوئی
اک مسلماں مشیر سرکاری

اتنی سرکار سے ہے استدعا
انتخاب اس طرح کا ہو جاری

آج جو ملک میں معزز ہیں
اور تعلیم سے نہیں عاری

ان مسلمانوں کے ہو شوریٰ سے
طرز اس انتخاب کا جاری

ہائی کورٹ میں چیف کورٹ میں
کب مسلماں کی آئے گی باری

شکوہ ہم کو نہ ہے شکایت کچھ
عرض ہے ازرہِ وفاداری

دیر میں ہم نے کی گزارشِ حال
اس خطا کے ہیں آپ اقراری

منھ سے کہہ دیتے ہیں جو دل میں ہے
جس قدر دیتی ہے زباں یاری

پر بغاوت کی بُو نہیں ہم میں
خیر خواہِ قدیم سرکاری

نہ کوئی بادشاہ غیر اپنا
نہ کوئی ہے شریکِ بازاری

کوششیں ہم کریں تخالف میں
یہ تو کہتی نہیں نمک خواری

سلطنت کی اگر شکایت میں
کوئی کلمہ زباں پہ ہو جاری

حق ہمارے مٹائے دیتی ہیں
غیر قومیں زراہِ عیاری

اس لیے آپ سے گزارش ہے
اب تو فرمایے مددگاری

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

نومبر ۱۹۰۶ء میں مولانا ظفر علی خان نے اپنے ماہ نامہ دکن ریویو میں شملہ وفد کے متعلق دو صفحات پر مشتمل ایک نہایت جان دار اداریہ لکھا تھا جس میں انھوں نے شملہ وفد کو ''مسلمانانِ ہند کی قومی زندگی کا ایک نیا باب'' قرار دیا تھا۔ اگر اس اداریے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ہندوؤں نے اس وفد اور اس کے مطالبات کی مخالفت کی تھی، لیکن دلائل مختلف تھے۔ ہندوؤں نے کہیں تو اس ''عرض داشت کو ہندوؤں کے حقوق کو پامال کرنے والا'' بتلایا اور کسی نے یہ کہا کہ ''یہ ڈیپوٹیشن نہ تو کل ہندوستان کی طرف سے ہے نہ کل مسلمانوں کی طرف سے''۔ ایک صدا یہ بلند ہوئی کہ یہ وفد ''افتراق و انتزاع کا ایک قابلِ افسوس وعظ'' تھا۔

آیئے اس اداریے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

> اکتوبر ۱۹۰۶ء کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کے ڈیپوٹیشن نے پہلی اکتوبر کو حضور وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قومی حقوق کی نگہ داشت کے لیے ایک عرض داشت پیش کی جسے مسلمانانِ ہند کی قومی زندگی کا ایک نیا ورق کہنا چاہیے۔ ہندوستان کی تاریخ میں نیشنل کانگریس کے بعد یہ پہلا سیاسی واقعہ ہے جس کے متعلق انگلستان اور ہندوستان کے ہر طبقے کے اخبارات نے مشرح اور قطعی الفاظ میں اپنی اپنی رائے ظاہر کی۔ اس ڈیپوٹیشن کے متعلق انگلستان کی ہر سیاسی جماعت اور نیز اینگلو انڈین طبقے کے تمام اخبارات نے عرض داشت پیش ہونے سے پہلے نہایت حوصلہ افزا اور اس کے بعد تہنیت آمیز الفاظ میں اظہارِ خیالات کیا، لیکن ہمیں نہایت افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندو پریس نے ابتدا ہی سے اس کی توہین و تضحیک و تحمیق کی اور آخر میں تو ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کی اس پولیٹیکل تحریک کو وہ اپنے قومی و ملکی اغراض کے لیے نہایت مضر سمجھتے ہیں۔
>
> انگلش اور اینگلو انڈین اخبارات نے عرض داشت کو نظرِ استحسان سے دیکھ کو جو خیالات اس کے متعلق ظاہر کیے وہ بذریعہ ترجمہ اردو اخبارات میں شائع ہو چکے اور ہو رہے ہیں۔ ہندو اخبارات نے باستثنائے بعض کے جنھوں نے دبی زبان سے عرض داشت کے مقاصد کی تعریف کی عام طور سے ناراضی اور مخالفت کا اظہار کیا اور کہیں تو عرض داشت کو ہندوؤں کے حقوق کو پامال کرنے والا بتایا اور کہیں یہ کہا کہ ڈیپوٹیشن نہ تو کل ہندوستان کی طرف سے

ہے نہ کل مسلمانوں کی طرف سے اور نہ اس پر لفظ ڈیپوٹیشن کی تعریف صادق آتی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چند سادہ لوح مسلمانوں کی طرف سے حکام کو اس ڈیپوٹیشن کی بدولت گویا نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے۔ ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ڈیپوٹیشن افتراق و انتزاع کا ایک قابلِ افسوس وعظ ہے۔

صوبہ بمبئی کا ایک صلح کل اخبار اپنی رائے ظاہر کرتا ہے کہ وائسرائے کے جواب سے نہ مسلمان خوش ہوئے نہ ہندو ناخوش، لیکن سب سے زیادہ وہ لطیف رائے ہے جو کانگریس کے ایک رکنِ رکین نے اس ڈیپوٹیشن کے متعلق ظاہر کی اور وہ یہ ہے کہ نہ مسلمانوں نے کچھ مانگا نہ وائسرائے نے کچھ دیا۔ حقیقت میں ہم نے کچھ نہ مانگا لیکن نہ اس وجہ سے کہ ہمیں مانگنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس لیے کہ ابھی ہم متکبر گداؤں کو مانگتے ہوئے غیرت آتی ہے:

فقیر ہیں پہ نہیں عادتِ سوال ہمیں

لیکن ہمارے دوست اطمینان رکھیں اب ہم بھی سوال کرنا سیکھتے جاتے ہیں اور آگے چل کر ایسا مانگیں گے کہ وہ بھی داد دیں گے، ابھی تو مشقِ اول ہی تھی۔

ڈیپوٹیشن سے مخالفت کرنے والے حضرات چاہے کچھ ہی کہیں، لیکن مسلمانوں کی عرض داشت کا لبِ لباب یعنی انتظامِ ملک میں مسلمانوں کو من حیث القوم شریک کیے جانے کی استدعا ایسی معقول اور معتدل اور مدلّل تھی اور اس کا جواب حضور وائسرائے نے ایسے ہمدردانہ اور تسلی بخش پیرائے میں دیا جس سے ہمیں قوی امید ہے کہ عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ ہم اپنے احباب سے نہایت فخر کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ مسلمانوں کے حقوق کا نظر انداز کیا جانا محالات سے ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ حضور وائسرائے نے بقول بعض تیسرے درجے کے کانگریسی اردو اخبارات کے گول مول الفاظ میں جواب دیا۔ سو اس کے متعلق ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ ہائی کورٹ کی ججی یا کونسل کی ممبری حضور وائسرائے کی:

مٹھی میں کیا دھری ہے کہ چپکے سے سونپ دیں

ہماری رائے میں اسلامی ڈیپوٹیشن نہایت کامیاب رہا اور قومی باغ کے بڈھے مالی نواب محسن الملک نے جو پودا آخری عمر میں لگایا ہے وہ بہت جلد بار آور ہو گا، لیکن یہ سب کچھ اُسی حالت میں جب کہ مسلمان اس پودے کو سینچتے رہیں اور اپنے دعاوی کی حمایت اور حقوق کی

حفاظت نہایت ادب کے ساتھ اور ساتھ ہی نہایت زور کے ساتھ کرتے رہیں۔ کھٹکھٹاؤ تاکہ تمھارے لیے دروازہ کھولا جائے، مانگو تاکہ تمھیں دیا جائے"۔[۱]

کانپور سے شائع ہونے والے مجلّہ زمانہ کے مدیر دیانرائن نگم نے شملہ وفد پر جو اداریہ لکھا تھا اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ وفد انگریزوں کی شہ پر ترتیب دیا گیا تھا، بلکہ زور اس بات پر دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونا چاہیے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس اداریے میں مدراس کے ایک کانگریسی سید محمد کا بھی ذکر ہے جن کے متعلق وطن نے معاملات کو واضح کر دیا تھا۔ زمانہ نے یہ الزام لگایا کہ چوں کہ وہ کانگریس کے ایک بہت ہمدرد تھے اور ان کو بعض مطالبات سے اتفاق نہ تھا اس لیے انھوں نے بڑی قابلِ تعریف آزاد خیالی سے اس میں شریک ہونے سے انکار کیا۔ نگم نے اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ:

> کہتے ہیں جب کسی مریض کی حالت بہت نازک ہو جاتی ہے تو تیر بہدف اور مجرب ادویات کا بھی اُلٹا اثر پڑا کرتا ہے۔ ہندوستان کی حالت ان دنوں کچھ ایسے ہی مریض کی ہو رہی ہے اور باہمی اتفاق و یک جہتی کے آزمودہ نسخے جو مولانا حالی اور نواب محسن الملک بہادر جیسے جیسے اطبّائے حاذق اس کے لیے تجویز کر رہے ہیں، بجائے صحت بخش اثر پیدا کرنے کے اور بھی ضرر رساں ثابت ہو رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پہلی اکتوبر کو جو ڈیپوٹیشن ہز ہائنس آغا خان کی سرکردگی میں حضور وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا یا ۱۶/ اکتوبر کو تقسیمِ بنگالہ کے سالانہ یادگار کے موقع پر نواب سلیم اللہ خان کے زیر تجویز و انتظام جو اظہار مسرت کے جلسے ہوئے وہ ہرگز نہ ہو سکتے۔
>
> محمڈن ڈیپوٹیشن کی تجویز کچھ عرصہ ہوا نواب محسن الملک بہادر نے بمبئی میں ایک تقریر میں کی تھی کیوں کہ ان کو خوف تھا کہ مبادا ہندو لوگ اپنی ناحق پسندی اور زیادتی کو کام میں لا کر مسٹر مورلے کے توسیعِ کاؤنسل کی تجویز سے خود ہی کُل فائدہ نہ اٹھالیں۔ تجویز کے کیے جانے کی دیر تھی خصوصاً جب ایسے ذی اثر، باوقار رہنمائے قوم کی زبان سے ایسی تجویز نکلی تو قوم اس پر کیوں کر کاربند نہ ہوتی۔ بہ سُرعت تمام تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ۲۵ ستمبر کو لکھنؤ میں ایک پرائیویٹ جلسہ ہوا، اور پہلی اکتوبر کو ڈیپوٹیشن وائسرائے کی خدمت میں جا پہنچا۔ اگرچہ بعض سربرآوردہ اخباروں نے اس پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ خیالات عامہ کا مظہر نہ تھا۔ مگر ہم کو اس رائے سے زیادہ اتفاق نہیں ہے۔ کسی ڈیپوٹیشن کے ری پریزنٹیو ہونے کے جو

ارکان ہو سکتے ہیں بیشتر اس میں موجود تھے۔ ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرات قریب قریب سب مسلمانانِ ہند کے ایک خاص پولیٹیکل جماعت کے جسے عام طور پر "علی گڑھ اسکول" کے نام سے نامزد کرتے ہیں، قائم مقام تھے۔ آنریبل سید محمد قاضی کبیر الدین وغیرہ وغیرہ بزرگانِ ملک کی شمولیت سے یہ نقص رفع ہو سکتا تھا۔ خیر یہ اور بات ہے، اس وقت اس قدر اصحاب کا مسلمانوں کو ہندوؤں سے تمام سیاسی امور میں علاحدہ رکھنے کے لیے یکجا ہو کر کوشش کرنا بھی سخت افسوس کی بات ہے۔ ہم کو خوف ہے کہ عام ہندوؤں میں کہیں یہ خیال نہ پھیل جائے کہ نیم تعلیم یافتہ اشخاص کا کیا ذکر۔ ہادیانِ قوم اسلام بھی عملی طور پر دونوں قوموں کے اتفاق اور یگانگت کے مخالف ہیں۔

منجملہ دیگر امور کے جن پر ڈیپوٹیشن نے زور دیا، اول یہ تھا کہ اہلِ اسلام کے اغراض و مقاصد، ان کی موجودہ پولی ٹیکل اہمیت اور ان کی گزشتہ شوکت و اقتدار پر نظر رکھتے ہوئے ہندوؤں سے جداگانہ ہیں اور ثانیاً یہ کہ ان اغراض و مقاصد کے محافظت کا طریقہ یہ ہے کہ کاؤنسل کے ممبریوں اور مناصب سرکاری کے تقسیم میں اہل اسلام کا ایک خاص حصہ مخصوص کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اِن دعوؤں میں کوئی بات نئی نہیں ہے۔ سر سید مرحوم کے زمانے سے ہمارے مسلمان ہم وطن انہی باتوں پر زور دیتے چلے آرہے ہیں۔ ہاں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر زمانہ گزر جانے کے ابھی تک انھوں نے فلاحِ قوم کے زیادہ پُراثر اور نتیجہ خیز مسائل پر عمل کرنا نہیں سیکھا۔ کاؤنسل کے ممبریوں یا سرکاری عہدوں سے مقابلہ ایک نہایت قلیل حصہ قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، جب اس ڈیپوٹیشن کے اغراض کے مقابلے میں کانگریس کے تخفیف ٹیکس ولگان کی کوششوں، افلاس عامہ کے دفیعہ کی تدابیر، تعلیم جمہور کی تحریک، صنعت و حرفت قومی کی ترویج و تقویت اور فلاح عام کے دیگر مسائل پر نظر ڈالیے تو خود بخود یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ مسلمان بھائیوں میں ابھی اپنے محدود حلقہ کی خواہشوں اور ضرورتوں کے سوا خلائق عامہ کے تکالیف اور ضروریات کے محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ڈیپوٹیشن نے کیوں محض تعلیم یافتہ فرقے کے لیے آسانیاں طلب کرنے میں خود غرضی کا اظہار کیا۔ وہ اپنے زیادہ غریب اور زیادہ بدقسمت بھائیوں کو کس کے اوپر چھوڑے دیتے

ہیں۔ کیا ان لوگوں کے لیے جن کے خیالات روزانہ اخباروں میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں، اس کی ضرورت تھی کہ وہ ایک جمعیت باندھ کر وائسرائے کی خدمت میں عرض معروض کے لیے جائیں شاید وہ لوگ جن کے خیالات کبھی گورنمنٹ پر ظاہر نہیں ہوتے۔ جو بے زبان ہیں اور جن سے مسلمانوں کی ۹۰ فی صدی آبادی بنی ہوئی ہے ایسی ضرورت سے بالاتر ہیں۔ یہاں پر کون انکار کر سکتا ہے کہ کانگریس ہی وہ قومی جماعت ہے جو کل افرادِ قوم کو یکساں فائدہ پہنچانے کی دعوے دار ہے اور سوائے کانگریس کے کوئی ایسی جماعت ملک میں نہیں۔

جہاں تک اخلاق و تپاک کا واسطہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈیپوٹیشن کو اعلیٰ درجے کی کامیابی ہوئی۔ حضور لارڈ منٹو نے بڑی گرم جوشی سے ممبروں کا خیر مقدم کیا۔ اُن کے مقاصد سے ہمدردی جتائی اور شاہانہ پیمانے پر ان کی دعوت کی۔ انھوں نے ڈیپوٹیشن کے اس دعوے کو تسلیم کیا کہ اہلِ اسلام خاص وقعت سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں، مگر اس کے دوسرے مطالبے پر سکوت ہی سب سے بہتر طرزِ عمل خیال کیا کیوں کہ کسی ایک جزو قوم کے لیے ممبریوں اور اسامیوں کی تعداد معین کر دینے کا وعدہ قریب قریب ناممکن ہے۔ ان اہم تبدیلیوں میں اور حکام بالادست کی منظوری بھی ضروری ہے پھر ان اعزاز کے لیے گورنمنٹ کی نگاہوں میں لیاقت و جوہر ذاتی ہی ہمیشہ بہترین معیار رہا ہے اور اب جب کہ وسعت تعلیم کے ساتھ اس معیار پر زیادہ زور دینے کا زمانہ آگیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ گورنمنٹ اپنے اصول کو فروگزاشت کرنے پر آمادہ ہو۔ اِس دلیل کا تازہ ترین ثبوت سر آرتھر لالی گورنر مدراس کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے حال میں ایک اسلامی ایڈریس کے جواب میں کی کہ ”اگرچہ گورنمنٹ ہندوستان کے کُل اجزا سے قوم کو یکساں نفع پہنچنے کے لیے آمادہ ہے، مگر وہ کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ محض ایک کمیونٹی کا قصہ معین کرنے کے لیے انصرام سلطنت میں ضعف یا خرابی پیدا کرے۔ کسی عہدے کے لیے لائق ترین امیدوار منتخب کیا جائے گا۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا عیسائی“۔ اور نہ صرف سر آرتھر کی یہ رائے ہے بلکہ یہی طرزِ عمل گورنمنٹ کا ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ خواہ چند سربرآوردہ اصحاب کے آنسو پونچھنے کے لیے ممکن ہے کہ اس کے برعکس وعدے کر لیے جائیں۔ کوئی صائب الرائے شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ عہدوں کی تقسیم میں کسی خاص قوم یا ذات کے لیے ایک خاص تعداد

مقرر کر دیتا نظام حکومت کے لیے خوف ناک و مضر نتائج سے مملو ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صوبہ جات میں لوکل گورنمنٹوں نے کم اندیشی سے ایسی حدیں مقرر کر دی ہیں، مگر ان کو یا تو اکثر یہ قیود توڑنا پڑتے ہیں یا رعایا کو ان قیود کا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے جس کا اظہار اس لیے نہیں ہوتا کہ رعایا بے زبان ہے۔

اور پھر اس حد بندی کی درخواست ہی کیوں کی جائے۔ گورنمنٹ کو کسی ہندو یا پارسی یا عیسائی سے (بشرط یہ کہ وہ انگریز نہ ہو) طرف داری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے اسلامی بھائیوں کا یہ معیار ہونا چاہیے کہ ہم اپنے تئیں بہترین امیدوار بنانے کی کوشش کریں۔ برعکس اس کے وہ یہ کوشش کرکے کہ ہماری خاص حالت میں نہ صرف لیاقت و جوہر ذاتی کا لحاظ کیا جائے بلکہ کچھ ہماری خاندانی شرافت کا بھی خیال رکھا جائے، اِس سے وہ اپنے تعلیمی معیار کو دیدہ و دانستہ گرا رہے ہیں، جس کا نتیجہ تعلیم کے حق میں آئندہ اچھا نہ ہو گا۔

اگر ملک کے نوجوانوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ جوہر ذاتی کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی مناصب اعلیٰ پر پہنچ سکتے ہیں تو اعلیٰ تعلیم کی ترقی یقیناً رُک جائے گی۔ پہلے یہ کوشش کی گئی تھی کہ نواب سید محمد صاحب بالقابہ کو اس ڈیپوٹیشن کا سرغنہ دیا جائے مگر چوں کہ نواب ممدوح کانگریس کے حامی ہیں اور انھیں ڈیپوٹیشن کے بعض مطالبوں سے اتفاق نہ تھا، انھوں نے بڑی قابلِ تعریف آزاد خیالی سے اس میں شریک ہونے سے انکار کیا۔ اس اثنا میں ہز ہائنس آغا خان ولایت سے واپس آ گئے اور وہی ڈیپوٹیشن کے رکنِ اعلیٰ قرار پائے۔[۱۸]

آخر میں شملہ وفد کے سلسلے میں ان مسلمان مصنفین اور لکھاریوں کا ذکر ضروری ہے جن کی تحریروں نے ہندو مفروضوں کے تار و پود بکھیر دیے۔ ان میں شیخ ظفر الاسلام، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن، ڈاکٹر سید رضی واسطی، ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، ڈاکٹر افضل اقبال اور ڈاکٹر احسن دانی شامل ہیں۔

ان مصنفین نے ہندوؤں کے مفروضات اور تار و پود بکھیر کر رکھ دیے، چناں چہ اب ہندو مؤرخین نے یہ بات تسلیم کرنا شروع کر دی ہے کہ شملہ کسی سازش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اسے خود مسلمانوں نے تشکیل دیا تھا۔ ایس ایم جین نے بھی تسلیم کیا کہ لارڈ منٹو کے نجی کاغذات اس معاملے پر وافر روشنی ڈالتے ہیں اور اب یہ بات بلا تردد کہی

جاسکتی ہے کہ شملہ وفد کے معاملے میں حکومت کا کوئی ہاتھ نہیں تھا اور اس کی تشکیل کا سہرا سراسر مسلمانوں کے سر تھا۔

ڈاکٹر شیلا سین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ شملہ وفد کے محرک نواب محسن الملک اور ان کے دوست تھے۔ بی آر نندا نے بھی شملہ وفد کی ترتیب و تشکیل کا ذمہ دار محسن الملک کا بتلایا ہے۔ در حقیقت مسلمان اب سر سید احمد کی تجویز کردہ پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے اور وہ پوری طرح بیدار ہو چکے تھے جیسا کہ خود نواب محسن الملک نے فرمایا تھا کہ مسلمان اب میری اور سر سید کی پالیسی سے متفق نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے حقوق کا تحفظ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

حوالہ جات:

۱۔ سعید، احمد، ۲۰۲۰ء، دو قومی نظریہ زندہ حقائق، نظریہ پاکستان ٹرسٹ، لاہور، ص

۲۔ ماہنامہ، مئی جون، ۱۹۰۵ء، دکن ریویو، حیدر آباد دکن، ص

۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، منقول از ہفت روزہ، 'وطن'، لاہور، ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۴۔ ہفت روزہ، وطن، ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۵۔ واسطی، سید رضی، سن ندارد، Lord Minto & the Indian Nationalist Movement، آکسفورڈ کیلی رنڈن پریس، ص ۱۹

۶۔ ہفت روزہ، وطن، ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۷۔ _____، ۵/ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۸۔ _____، ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۹۔ مطیع الرحمٰن، سن ندارد، From Consultation to Confrontation، لندن، ص ۸۔۹

۱۰۔ ہفت روزہ، وطن، ۵ اکتوبر، ۱۹۰۶ء

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، منقول از ہفت روزہ، 'وطن'، لاہور، ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۱۳۔ ہفت روزہ، وطن، ۲۱ دسمبر، ۱۹۰۶ء

۱۴۔ ہفت روزہ، وطن، ۱۶/ اکتوبر، ۱۹۰۶ء

۱۵۔ ہفت روزہ، وطن، ۲ نومبر، ۱۹۰۶ء

۱۶۔ The Civil & Military Gazette, 6 October, 1906

۱۷۔ The Civil & Military Gazette, 5 October, 1906

۱۸۔ ماہنامہ دکن ریویو، نومبر ۱۹۰۶ء

Abstract

Under the leadership of Agha Khan III, a Muslim delegation comprising 35 prominent Muslim leaders met Lord Minto, the Governor General, on 1st October 1906 wherein some demands from the Muslim population were presented. There was a demand for the separate election as well which paved the way for establishing Pakistan. This article aims at highlighting details, based on rare periodicals like monthly Decan Review, weekly Watan, Lahore, Aligarh Institute Gazette, the Civil & Military Gazette and archival research, how Muslim leadership and population strived hard to get the demand of separate election recognized as the Hindu and anti-Pakistan historians put up resistance against the separate election believing that the seed sawn for the separate election was from the colonial's rules. Aside from the sources based on periodicals, the writer used many literary sources and a detailed poem of Khawaja Abdul Rauf Ishrat Lakhnavi. The article presents periodicals owned by Hindus showing abusive language for Muslims misguide their captive audiences.

Keywords: Shimla Delegate, Separate election, Lord Minto, biased Hindu periodicals.